مسند الهند شاہ ولی اللہ کی ایک اہم تصنیف
”شرح تراجم أبواب البخاری“
تعریف و تقدیم

ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی

ابن خلدون نے لکھا ہے کہ: بخاری کی احادیث کی ان کے تراجم ابواب سے مطابقت امت مسلمہ پر امام بخاری کا ایک قرض ہے۔ ابن خلدون کا یہ تبصرہ اگر ایک طرف تراجم ابواب البخاری کی قدر و منزلت اور اس میں پوشیدہ بے شمار علمی فوائد و دقائق کی نشاندہی کرتا ہے، تو دوسری طرف اس امر کا بھی غماز ہے کہ کم از کم ابن خلدون کے عہد تک مومنین امیر المومنین فی الحدیث کے اس قرض سے عہد برآ نہیں ہو سکے تھے۔

امام بخاری نے اپنی الجامع الصحیح کی صحت وثقاہت کے ساتھ ساتھ اس کی تبویب و تقسیم اور ابواب کے تراجم کے انتخاب کا خاص اہتمام کیا ہے۔ کتاب کا آغاز ”إنما الأعمال بالنيات“ سے فرما کر اپنے حسن نیت اور سلامتیٔ مقصد کی طرف اشارہ فرما دیا، یا حسن نیت اور سلامت مقصد کی اہمیت وضرورت کے پیش نظر اس حدیث سے اپنی کتاب کا افتتاح کیا۔ پوری کتاب میں ابواب کی ترتیب اعلیٰ درجے کی مقصدیت کی حامل ہے۔ بدء الوحی سے کتاب کی ابتداء کی کیونکہ دین کی ابتداء وحی سے ہی ہے، پھر ابواب ایمان کا ذکر کیا کیونکہ وہ دین کی بنیاد ہے، پھر ابواب علم کا بیان فرمایا کیونکہ علم آلۂ دین کی حیثیت رکھتا ہے، اور اسی طرح تمام ابواب، اور اپنی کتاب کا اختتام ابواب توحید سے کیا کیونکہ ظاہر و باطن کی اصلاح اسی سے ہے۔

بخاری شریف کے تراجم ابواب صرف ضمنی عناوین کی حیثیت نہیں رکھتے ہیں جو بطور فواصل اور معمولی قسم کی توضیحات کے لئے استعمال ہوتے ہیں بلکہ علمائے امت کا اجماع ہے کہ یہ احترازی نوعیت کے حامل ہیں اور امام بخاری کے فقاہت کی دلیل، اور ان کے علمی مسلک کے ترجمان ہیں۔ چونکہ امام بخاری کسی مخصوص فقہی مسلک سے متعلق نہیں تھے بلکہ خود مجتہد تھے لہٰذا ان تراجم کا مصداق و مدلول متعین کرنے میں خاص دشواری پیش آتی ہے۔ رہی ان کی شافعیت کی بات تو یہ شوافع کے حسنِ ظن سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ بعض مسائل میں امام شافعی سے ان کی موافقت محض اتفاق ہے جیسے رفع الیدین، والجہر بالتامین وغیرہ۔ ورنہ انھوں نے بے شمار مسائل میں امام شافعی کی رائے کے خلاف رائے کو اختیار کیا ہے، جیسے: وضوء عند القبلة، ومس الذکر ومس المرأة، والقلتين، والجهر بالبسملة، وتثليث الماء لمسح الراس، وطهارة المني، وقيام المأموم

یہ مقالہ ادارۂ علوم اسلامیہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں ۱۰، ۱۱ر دسمبر ۲۰۰۴ء میں منعقد سیمینار میں پڑھا گیا۔ اس سیمینار کا عنوان تھا: ”علم حدیث میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی خدمات“۔

بحذاء الامام وغیرہ، بعض ایسے مسائل ہیں جن میں امام بخاری نے امام شافعی کی مخالفت کی ہے، بلکہ تحقیقی امر یہ ہے موافقته للإمام الأعظم ليس بأقل مما وافق فيه الشافعي، اوراسی طرح حمیدی کی شاگردی کی بنیاد پر انھیں حنفیوں میں شمار کرنا بھی خوش گمانی سے زیادہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان تراجم کے مقاصد کی تعیین وتحدید، ان کے اغراض کی تشریح و توضیح اور تراجم واحادیث کے درمیان توفیق وتلفیق علم حدیث کے مہمات میں سے شمار ہوتا ہے۔ بے شمار علماء ومحدثین نے ان تراجم کے مقصود ومدلول کی تعیین وتوضیح میں اپنی علمی کاوشیں صرف کیں۔ تمام شارحین بخاری نے ان تراجم پر خصوصی توجہ دی اور بہت سے علماء نے اس موضوع پر مستقل کتابیں اور رسائل تصنیف کئے، ان میں ناصر الدین ابن منیر اسکندرانی کی "المتواری علی تراجم البخاری"، ابوعبداللہ محمد بن عمر الفہری المتوفی ۷۲۱ھ کی "ترجمان التراجم"، ابوعبداللہ محمد بن منصور المغراوی السجلماسی کی تصنیف "حل الأغراض المبهمة في الجمع بين الحديث والترجمة" وغیرہ مشہور تصنیفات ہیں۔ صاحب بستان المحدثین نے بدرالدین محمد الدمامینی المتوفی ۸۲۸ھ کی ایک کتاب "تعليق المصابيح على أبواب الجامع الصحيح" کا تذکرہ کیا ہے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب نے یہ بھی کہا ہے دمامینی نے یہ کتاب سلطان احمد شاہ گجراتی کے لئے لکھی تھی، لیکن کشف الظنون کے مطابق "مصابيح الجامع" کے آخر میں ہے کہ اس کی تکمیل زبید یمن میں ہوئی ہے اور اس کو حاجی خلیفہ نے شروح بخاری میں شمار کیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ مصابیح اور تعلیق المصابیح دو الگ الگ تصنیفات ہوں اول الذکر تراجم بخاری کی شرح میں جو ہندوستان میں لکھی ہو، اور ثانی الذکر بخاری کی شرح ہو جسے یمن میں لکھا ہو، یا وہاں اس کی تکمیل کی ہو۔ اس لئے کہ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ دمامینی نے احمد آباد میں اپنے طویل قیام کے دوران سلطان احمد شاہ کے لئے کئی کتابیں تصنیف کی تھیں۔ جیسے "تحفة الغريب شرح معنى اللبيب"، "شرح الوافي" اور "مختصر حياة الحيوان الكبرى" وغیرہ۔ بہرکیف اگر "تعليق المصابيح" ہندوستان میں تصنیف نہیں کی گئی تو اس موضوع پر پہلی مستقل ہندوستانی تصنیف مسند الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی کتاب "شرح تراجم أبواب البخاري" ہے، اگرچہ ہندوستان کے تمام شارحین بخاری نے - اپنے عرب نظراء کی طرح - اس موضوع پر کچھ نہ کچھ خامہ فرسائی کی ہے۔

شرح ابواب تراجم البخاری حضرت شاہ صاحب کی ایک معرکۃ الآراء اور مہتم بالشان تصنیف ہے۔ قاسمی صاحب کے مطابق شاہ صاحب نے اس کی تصنیف ۴۶-۱۱۴۵ھ/۳۳-۱۷۳۲ء میں فرمائی۔ کتاب متعدد بار شائع ہوچکی ہے۔ اصح المطابع دہلی اور مطبع نورالانوار کے نسخوں میں تاریخ طبع موجود نہیں ہے۔ دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد سے کتاب تین بار شائع ہوئی ہے۔ پہلی بار ۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء میں، تیسری بار ۱۳۶۸/ ۱۹۶۹ میں۔

کتاب کے ان مطبوعہ نسخوں اور فکر وآثار ولی اللہی سے متعلق کتابوں میں اس کا نام ''شرح تراجم ابواب البخاری'' یا ''رسالہ شرح تراجم ابواب صحیح البخاری'' ملتا ہے، جس سے یہ وہم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے اس تصنیف میں بخاری کے تمام تراجم ابواب کو شامل کیا ہے، جبکہ واقعہ اس کے برخلاف ہے۔ حضرت شاہ نے بخاری شریف کے چھہتر کتابوں میں سے

صرف چھبیس کتاب کے ۳۷۸ ابواب کے تراجم کی شرح لکھی ہے۔ جب کہ بخاری شریف کے جملہ ابواب کی تعداد ۳۶۵۵ ہے یعنی شاہ صاحب نے جن ابواب کے تراجم کی شرح لکھی ہے وہ کل ابواب کا تقریباً دسواں حصہ ہے۔ لہذا اگر کتاب کا نام شرح تراجم بعض ابواب البخاری ہوتا تو زیادہ مناسب ہوتا۔ اور مجھے خیال ہو رہا ہے کہ میں نے کسی کتاب میں اس کا یہ نام دیکھا بھی ہے، لیکن ابھی ذہن اس مصدر کی نشاندہی سے قاصر ہے۔ واضح رہے کہ بخاری کے بہت سے ابواب بغیر تراجم کے ہیں لیکن پھر بھی ان کی تعداد اتنی نہیں ہے جو مذکور نسبت پر کچھ زیادہ اثر ڈال سکیں۔ شاہ صاحب نے کچھ ایسی کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے جو بخاری میں موجود نہیں ہے جیسے کتاب صلوٰۃ الخوف، کتاب العیدین، کتاب ماجاء فی الوتر، کتاب سجود القرآن، کتاب التہجد اور کتاب الرد علی الجہمیۃ۔ دراصل اول الذکر پانچ کتابیں کتاب الجمعہ کے تحت اور آخر الذکر کتاب التوحید میں ابواب کے عنوان سے شامل ہیں۔

تو کیا شاہ صاحب کا یہ عمل ناقص ہے؟ اور امام بخاری کا قرض امت پر آج بھی باقی ہے؟ علاوہ ازیں یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے اس کام کو ناقص کیوں چھوڑا، بظاہر ایسا کوئی مانع بھی نہیں تھا۔ شاہ صاحب نے اپنی وفات کے تیس سال پہلے اس کام کو مکمل کیا۔ یہ ان کی زندگی کا وہ عہد ہے جس میں شاہ صاحب پوری طرح سے تصنیف وتالیف کے لئے وقف تھے، اور ان سب سے بڑھ کر اس کام کے بظاہر نامکمل ہونے کے باوجود شاہ صاحب نے اپنے مقدمہ میں اشارۃً وکنایۃً بھی کچھ ایسا نہیں لکھا جس سے یہ پتہ چلے کہ ان کا یہ کام نامکمل ہے یا انھوں نے صرف بعض تراجم کی شرح پر اکتفا کیا ہے۔

اس قضیے کے حل کے لئے جب میں فتح الباری کی ورق گردانی کی تو یہ عجیب وغریب عقدہ کھلا کہ امام ابن حجر نے بخاری شریف کے جن تراجم ابواب کی باقاعدہ شرح لکھی ہے ان کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے بلکہ شاہ صاحب کی اس مختصر تصنیف سے بھی کہیں کم ہے۔ یہاں دو باتوں کی وضاحت ضروری ہے اول یہ کہ امام ابن حجر نے جن تراجم ابواب کی محض لغوی ونحوی شرح کی ہے میں نے انھیں شامل نہیں کیا اور ''باقاعدہ شرح'' سے میری یہی مراد ہے اور دوئم یہ کہ فتح الباری کا میرا یہ مطالعہ استقراء ناقص کے طور پر تھا میں نے اس کی ابتداء، درمیان اور آخر کے صرف چند کتابوں کے ابواب کو دیکھنے پر اکتفا کیا ہے۔ اور ان ابواب میں میں نے پایا کہ شاہ صاحب نے امام ابن حجر کے مقابلے میں کہیں زیادہ تراجم کی شرح کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شاہ صاحب نے بخاری کے انھیں تراجم ابواب کی شرح فرمائی ہے جو ان کے نزدیک قیود احترازیہ پر مشتمل تھیں، یا جن سے امام بخاری نے مسائل کا استنباط کیا ہے، یا جو ان کے کسی فقہی یا کلامی مسلک کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اور وہ تراجم جو صرف عنوان باب کی حیثیت رکھتے ہیں شاہ صاحب نے ان سے تعرض نہیں کیا اور نہ یہ ان کا مطلوب تھا۔ اور یہ بات ہرگز معقول ومقبول نہیں ہو سکتی کہ بخاری کا ہر ترجمہ باب احتراز کے لئے ہو، جب کہ الجامع الصحیح کی تدوین وتالیف کا یہ بنیادی مقصد بھی نہیں تھا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ شاہ صاحب کی یہ تصنیف اپنے موضوع پر ایک مکمل تصنیف ہے۔ اس کے مکمل ہونے کی ایک داخلی شہادت یہ بھی ہے شاہ صاحب کی یہ تصنیف بخاری کی پہلی کتاب کتاب الایمان سے لے کر

اس کی آخری کتاب کتاب التوحید تک کو مشتمل ہے۔

اگر شاہ صاحب کو اپنا یہ عمل ناقص ونامکمل رکھنا ہوتا تو اس شمول واحاطہ کے بجائے ایک طرف سے چند یا چند سو ابواب کی شرح فرمادیتے۔ جیسا کہ دوسرے مصنفین نے کیا ہے۔ چنانچہ شیخ سجلماسی نے اپنی کتاب " حل الأغراض المبهمة فی الجمع بین الحدیث والترجمة" میں صرف ابتدائی سو تراجم ابواب کی شرح کی ہے یا شیخ ابوعبداللہ محمد بن عمر الفہری السبتی نے "ترجمان التراجم" میں کتاب الصیام تک کے تراجم ابواب کی شرح کی ہے۔

مقدمہ کتاب میں شاہ صاحب نے سب سے پہلے اپنے اس مشہور موقف کو دہرایا ہے، جس کا ذکر وہ مسوی، مصفی اور حجۃ وغیرہ میں بار بار کر چکے یعنی بخاری نے اپنی کتاب کی بنیاد مؤطا امام مالک پر ڈالی۔ البتہ یہاں مؤطا کے ساتھ کچھ اور کتابوں کو اس امر میں شریک کردیا ہے، فرماتے ہیں کہ :" أول ماصنف أهل الحديث فی علم الحديث جعلوه مدونا فی أربعة فنون: فن السنة أعنی الذی يقال له الفقه مثل مؤطا مالك وجامع سفيان، وفن التفسير مثل كتاب ابن جريح، وفن السير مثل كتاب محمد بن إسحاق، وفن الزهد والرقاق مثل كتاب ابن المبارك فأراد البخاری رحمه الله أن يجمع الفنون الأربعة فی كتاب ويجرده لما حكم له العلماء بالصحة قبل البخاری وفی زمانه، ويجرده للحديث المرفوع المسند ۔ ومافيه من الآثار وغيرها إنما جاء به تبعا لا بإصالة ولهذا سمی كتابه بالجامع الصحيح المسند" اس عبارت سے صاف واضح ہے کہ امام بخاری نے تمام مصنفین کی طرح اپنے ماقبل کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے، اور اس میں مؤطا کو کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ بخاری ایک مستقل بالذات تصنیف ہے، اسے مؤطا کی شرح یا امتداد محض قرار نہیں دیا جاسکتا، بلکہ اپنی صحت وثقاہت، حسن ترتیب وتالیف اور استنباط مسائل میں ان کتابوں سے بدرجہا بہتر ہے جن سے امام بخاری نے استفادہ کیا ہے۔ خود شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ " هذا أمر لم يسبق إليه غيره"۔

اس کے بعد شاہ صاحب نے ان اصول کا ذکر کیا ہے جن کی روشنی میں ان تراجم کا مقصود ومدعا سمجھا جاسکتا ہے۔ شاہ صاحب کے دس نکاتی اصول نہایت جامع ہیں ان میں سے بعض کئی کئی اصلوں پر مشتمل ہیں، مثلاً امام بخاری ترجمے میں ایسی حدیث مرفوع ذکر کرتے ہیں جو ان کے شرط کے مطابق نہیں، پھر باب میں اپنی شرط کے مطابق اس کے لئے شاہد لاتے ہیں یہ بہت شائع اصل ہے اس کی مثال "باب الأمراء من قريش" ہے لیکن بخاری نے اس کے تحت جو حدیث ذکر کی ہے وہ ہے " لايزال هذا الأمر فی قريش مابقی منهم اثنان" یعنی جس حدیث مرفوع کو ترجمہ باب بنایا، اس کے بجائے دوسری حدیث کو ذکر کیا۔ اسی طرح بقیہ تمام اصول۔

ان اصول عشرہ کے بعد شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ان تراجم میں سے اکثر عبدالرزاق اور ابن ابی شیبہ کے تراجم کے تعقبات ہیں۔ شاہ صاحب کے فرمودات کو اگر فتح الباری کے شروح تراجم سے موازنہ کیا جائے تو واضح ہوتا ہے، شاہ صاحب نے فتح سے استفادہ تو ضرور کیا ہے، لیکن وہ ان تراجم کے مقصود ومدلول کو متعین کرنے میں اور تراجم واحادیث میں

تطبیق دینے میں امام ابن حجر سے زیادہ کامیاب رہے ہیں۔ مثلاً "باب کیف کان بدء الوحی" کی شرح میں لکھتے ہیں: مقصود اصلی وحی کا اثبات ہے اور یہاں وحی سے مراد وہ وحی ہے جو نفس حدیث وکلام ہے اور بدء الوحی کا مطلب مبدأ الوحی ہے اور اس طرح "کیف کان بدء الوحی" کا مطلب یہ ہوا کہ:" کیف کان مبدأ ماروی عنہ صلی اللہ علیہ وسلم"، یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ مروی ہے اس کے مبدأ کی کیفیت کیا ہے، اور پھر احادیث باب کے ذریعے ثابت کیا کہ یہ مبدأ وحی اور فرشتے کا توسط تھا یعنی ہم ان احادیث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لیا، انھوں نے جبریل علیہ السلام سے، اور انھوں نے اللہ تعالیٰ سے۔ اور اس طرح یہ اعتراض خود بخود اٹھ گیا کہ وحی کی کیفیت کا ذکر صرف ایک حدیث میں ہے بقیہ پانچ حدیثیں ترجمہ باب سے مطابق نہیں ہیں۔

متکلمین ومحققین کے نزدیک ایمان صرف تصدیق کا نام ہے، لیکن محدثین عمل کو بھی ایمان کا جز مانتے ہیں۔ شاہ صاحب بخاری کے ان تمام تراجم کو جن میں مختلف اعمال کو ایمان کا حصہ قرار دیا گیا ہے، قیود احترازیہ مانتے ہیں۔ لہٰذا کتاب الایمان میں شروع ہی میں اس قضیہ کو اٹھایا اور اس کا ایک ایسا حل پیش فرمایا جو تمام مسائل کو ختم کر دیتا ہے اور حقیقت ومجاز کا سہارا لئے بغیر فرماتے ہیں کہ ایمان دو ہیں یعنی ایمان کا اطلاق دو معنوں پر ہوتا ہے اور دونوں حقیقت پر مبنی ہیں۔ پہلا ایمان انقیاد اور دوسرا ایمان حقیقت اور ان میں سے کوئی مجازی اطلاق نہیں ہے۔ مثلاً کمزور وضعیف آدمی کو بھی آدمی کہا جاتا ہے من غیر مجاز حقیقی طور پر، اور اس آدمی کو بھی حقیقی معنوں میں آدمی کہا جاتا ہے جو جملہ انسانی کمالات کا جامع ہو۔

شاہ صاحب نے بہت سے تراجم کی شروح میں متقدمین سے موافقت کی ہے۔ جیسے: باب حب الرسول من الإیمان، باب من الدین الفرار من الفتن، باب من کرہ أن یعود فی الکفر، باب علامة المنافق، باب من سئل علما وھو مشغول فی حدیثہ وغیرہ، میں شاہ صاحب کی شرح ابن حجر کی شرح سے ملتی جلتی ہے، لیکن بایں ہمہ ان میں سے ہر ایک میں شاہ صاحب نے کوئی نہ کوئی ایسا اضافی نکتہ بیان کیا ہے جو فتح الباری میں نہیں ہے۔ اور اکثر شاہ صاحب کا یہی نکتہ بنیادی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ مثلاً باب: من سئل علما وھو مشتغل فی حدیثہ کے ضمن میں ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس میں عالم وطالب علم کے ادب کو بتایا گیا ہے عالم کا ادب یہ ہے کہ ایسے سائل کو ڈانٹے نہیں بلکہ اس سے اعراض کرے حتی کہ اپنی گفتگو مکمل کرلے اور طالب کا ادب یہ ہے کہ اگر کوئی گفتگو میں مشغول ہو تو اس سے سوال نہ کرے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس ترجمے کی اصل غرض یہ ہے کہ اگر کوئی گفتگو میں مشغول ہو اور سائل کو فوری جواب نہ دے تو یہ کتمان علم میں نہیں۔ ظاہر ہے کہ شاہ صاحب کی یہ تطبیق ابن حجر کی تطبیق سے اولیٰ اور کہیں زیادہ معنی خیز ہے۔

علامہ ابن حجر اور سابقین نے بخاری کے بے شمار تراجم سے کوئی تعرض نہیں کیا ہے لیکن ان تراجم کی شرح بھی ہمیں شاہ صاحب کے اس رسالے میں ملتی ہے۔ اس کی ایک مثال باب من رفع صوتہ بالعلم ہے۔

اس رسالے کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بعض ایسے تراجم ابواب کی بھی شرح ملتی ہے جن کے بارے میں محدثین کا عام خیال ہے کہ: ان تراجم کی احادیث ابواب سے تطبیق ناممکن نہیں تو متعذر ضرور ہے۔ اس کی ایک

مثال: باب إذا فاته العيد يصلي ركعتين، وكذلك النساء ومن كان في البيوت والقرى۔ **اس کے تحت ایک حدیث ذکر کی ہے کہ:** ''عن عائشة أن أبا بكر رضي الله عنه دخل عليها وعندها جاريتان في أيام مِنى تُدفّفانِ وتضربان والنبي صلى الله عليه وسلم متغشٍّ بثوبه فانتهرهما أبو بكر فكشف النبي صلى الله عليه وسلم عن وجهه فقال دعهما يا أبابكر فإنها أيام عيد وتلك الأيام أيام مِنى الخ۔ علماء فرماتے ہیں کہ اس حدیث اور اس کے ترجمۂ باب میں مطابقت ممکن نہیں کیونکہ دونوں میں کوئی ربط نہیں ہے، لیکن شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ امام بخاری کا ترجمۂ باب میں یہ کہنا کہ اگر کسی کی عید کی جماعت چھوٹ جائے تو وہ دو رکعت تنہا پڑھ لے، مرد ہو یا عورت، شہری ہو یا دیہاتی۔ اور حدیث عائشہ مذکور سے بخاری کا وجہ استدلال اللہ کے رسول کا یہ فرمان ہے ''فإنها أيام عيد'' یہ فرمان بغیر کسی قید کے ہے یعنی عید منانا آج کے دن کا حق ہے اور یہ حق مرد و عورت آزاد و غلام اور مدرک جماعت اور فائت جماعت سب کو بلا استثناء حاصل ہے، اور ترجمۂ باب اور حدیث میں یہی وجہ تطبیق بھی ہے۔

اس طرح شاہ صاحب کی یہ کتاب ان کی عبقریت کی دلیل اور حدیث رسول میں ان کی بالغ نظری کی سند ہے اور فہم و تفہیم بخاری کے لئے ایک ناگزیر ضرورت بھی ہے۔ اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس مختصر لیکن جامع تصنیف کے ذریعے حضرت شاہ صاحب نے امیر المومنین فی الحدیث امام بخاری رحمہ اللہ کے قرض کو بڑی حد تک ادا فرما دیا۔ لیکن خود شاہ ولی اللہ کا ایک قرض اسلامیان ہند پر ہے اور وہ قرض ہے ان کی فکر، اور ان کے مسلک و مشرب کی تنفیذ و تطبیق۔ بخاری کا قرض شاہ صاحب نے ادا کیا ہے، دیکھنا یہ ہے کہ شاہ صاحب کا یہ قرض کب کیسے اور کس کے ذریعے ادا ہوتا ہے۔

لعل الله أن يحدث بعد ذلك أمرا